R. No. 2190/57

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 2

Telegrams "ANJUMAN"

ایک پرچہ

تاریخ اشاعت

جلد ۲۱ شمارہ ۴۲ | ایڈیٹر آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ نومبر ۱۹۶۲ء

عبدالمغنی

اُردو افسانے کا ایک رُخ

مغربی ادبیات کے زیر اثر اُبھرنے والی صنفوں میں مختصر افسانہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں اُردو ادب نے کمال حاصل کیا ہے، اس حد تک کہ اس کے بعض لکھنے والوں کو بین الاقوامی حیثیت مل گئی ہے اس لئے اس صنف کے ادبی معیار کے متعلق ہمیں برابر چوکنا رہنا چاہئے۔ ناقدوں کو چاہئے تھا کہ ہر سال اس کے فکر و فن کا جائزہ لیتے رہتے تاکہ اس طرح شعور بڑھتا اور بے شعوری کم ہوتی۔ افسانے کے متعلق اس خبرداری کی خاص کر ضرورت ہے۔ کہانی لکھنے کو عام طور پر آسان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، کہانی پڑھنے والوں کی تعداد کثیر ہونے کے سبب بازار میں اس کی مانگ اور کھپت زیادہ ہوتی ہے۔ ان دو اسباب کا خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ چنانچہ یہاں تیسرے بلکہ چوتھے درجے کے قلم کاروں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ اور اس انبوہ میں قدر اول کے فن کاروں کے لئے بھی معیار کا برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جب کوئی چیز بازار میں زیادہ مقبول ہو جاتی ہے تو اس کی بے شمار نقلیں بھی چل پڑتی ہیں۔ خریدنے والوں کو دھوکا تو ہوہی جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ سستا اور سہل الحصول سمجھ کر عوام (بعض اوقات خواص بھی) نقل ہی کو اصل پر ترجیح دینے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اصل کی تخلیق ہی رک جاتی ہے۔ اُردو افسانہ اس وقت کچھ ایسی ہی صورت حال سے دو چار ہے۔

ہمارے ادب میں مختصر افسانہ ایک جدید صنف ہے ... صدی کے نصف اوّل میں اس کا نشوونما ہوا۔ پریم چند نے اس کی روایت بنائی۔ اس کے بعد یہ ترقی پسند تحریک کا آلۂ کار بن گئی۔ اصطلاح میں ترقی پسندی سے مراد مارکسیت ہے اس وقت مجھے اُردو افسانے کے جس رُخ پر تنقید کرنی ہے وہ اسی مارکسیت کا پروردہ ہے۔ اس کو پروان چڑھانے میں غیر شعوری طور پر ان ادیبوں کا بھی حصّہ ہے جن کو مارکس کے فلسفۂ سماج سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس مرحلے پر میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ مارکسی ناقدوں کا پھیلا ہوا یہ مغالطہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ پریم چند کی بنائی ہوئی روایت اور ترقی پسندی ایک ہی چیز ہے۔ اس مفروضے کی بنا اس حادثے پر ہے کہ پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے قیام کے لئے بلائے گئے کنونشن کی صدارت کر دی تھی۔ بس یہ ایک حادثہ بنیاد بن گیا ہے۔ اس ادبی مغالطے کا کہ پریم چند اُردو افسانے کی روایت کے ساتھ ساتھ اس میں پائی جانے والی موجودہ مارکسیت کے بھی بانی ہیں۔ مجھ کو حیرت ہے کہ اتنا بڑا ادبی جھوٹ کس طرح ہمارے ناقدوں کے حلق سے اترتا رہا۔ پریم چند کی پوری زندگی اور اس زندگی بھر کا ادبی کردار ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور چشم تصوّر ہی صرف یہ ہنگامی بات کہ انھوں نے اپنی آخر عمر میں ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں ایک اعزازی منصب چند گھنٹوں کے لئے قبول کر لیا۔ کیا اس تاریخی حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک ایک مبہم اور مجہول قسم کی کوشش تھی، اس کا فکری نصب العین قطعی غیر واضح تھا؟ چنانچہ اس وقت نہ تو مارکس کا نام تھا نہ اشتراکی اصولوں کا پرچار، اور نہ پریم چند مارکسی پیچ و خم سے واقف تھے۔ انھوں نے خلوص کے ساتھ صرف یہ سمجھا تھا

کہ کچھ نوجوان اب ان ہی افکار کی باضابطہ ترویج کرنی چاہتے ہیں جنھیں وہ ایک عمر سے اپنی کہانیوں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ موصوف کے خطبۂ صدارت میں بھی چند عام انسانی اقدار کی ہی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان کی تعبیر میں نہ کسی تبصرہ کار جو بھی کھینچ تان کریں بہر حال، پریم چند تو ترقی پسندی کے مارکسی پیچ و خم نمایاں ہونے سے پہلے ہی رحلت کر گئے۔ اور انھیں نہ تو اصطلاحی ترقی پسندی کو سمجھنے کا موقع ملا اور نہ اس کے متعلق کوئی واضح رویّہ اختیار کرنے کا۔ لیکن اشتراکی مبلّغوں کو ضرور موقع مل گیا کہ خود کو پریم چند کا سجادہ نشین ثابت کر کے ادب میں اپنا بھرم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ پیر مغاں کے حین حیات سے جب کوئی واضح سند نہیں مل سکی تو پیش گوئی پر اکتفا کیا گیا کہ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو... حالاں کہ خدانخواستہ اگر کچھ دن اور وہ واقعی زندہ رہ جاتے تو ان کا بھی وہی حشر کیا جاتا جو آل احمد سرور، اختر اورینوی، علی عباس حسینی وغیرہ کا کیا گیا۔

بہر حال، اس وقت اردو افسانے میں دو روایتیں نمایاں ہیں، ایک تو اصلی روایت پریم چند کی ہے، دوسری اسی کی نقل ترقی پسندی کی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اصل و نقل میں بس اتنی ہی مماثلت ہے جتنی خالص سونے اور اس کے ملمع میں ہو سکتی ہے۔ پریم چند کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے کہانیوں میں انسانیت کی بنیادی قدروں کو ابھارا۔ شجاعت، مروت، ایثار، اخوت، ذہانت اور پاکیزگی وغیرہ جیسے بلند اور اہم انسانی اوصاف پر زور دیا اس کے برخلاف اشتراکی ترقی پسندی نے قدروں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو زیادہ تر وقتی مسائل میں الجھائے رکھا، ایسے مسائل جن کی نوعیت سیاسی ہے۔ پریم چند نے انسانی بھائی چارے کا سبق دیا تھا۔ ان کے خود ساختہ جانشینوں نے طبقاتی آویزش کی تلقین کی۔ ایک طرف پریم چند کی آشتی اور شانتی ہے، دوسری جانب ترقی پسندوں کی جدلیات۔ دونوں کے درمیان تفریقات کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ پریم چند کا نقطۂ نظر اخلاقی ہے اور ترقی پسندوں کا معاشی۔ اس بنیادی فرق سے تفاوت راہ کے بے شمار گوشے پیدا ہوتے ہیں، اس مختصر صحبت میں میں صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

یہ ایک قول محال یا ستم ظریفی ہے کہ پریم چند کی مفاہمت فکر و عمل کی جرأت پر مبنی ہے، اس کے برعکس اشتراکیت پسندوں کی مفاہمت، کاشا خسانہ دل و دماغ کی نسائیت ہے۔ محبت کبھی فرہاد کو کوہ کنی اور قیس کو دشت نوردی پر ابھارتی تھی کبھی عشق آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا تھا۔ لیکن اب ہمارے افسانوں کے ہیروؤں کو یہی جذبہ خانہ نشینی، اور اسیر زلف رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس وقت ہمارے افسانوں میں عشق کا ایک عجیب تصور رواج پا رہا ہے۔ اب یہ خارا شگافی کا محرک نہیں رہ گیا ہے۔ صرف نسائیت سازی کا باعث ہے۔

ایک مجہول قسم کا گھریلو پن، ذاتی اور خاندانی سلامتی، خوش حالی کی تمنا، عشق کوشی کی آرزو، بہت آگے بڑھے تو کسی محتاج کے ساتھ ہمدردی کا اظہار۔ زندگی ان ہی چار دیواریوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ ان حدود سے باہر کبھی کوئی نقل و حرکت، اسٹرائک اور توڑ پھوڑ کی صورت میں ہوتی بھی ہے تو اس کا مطمح نظر ذاتی، خاندانی، طبقاتی مفاد کے اوپر نہیں اٹھتا۔ بودے قسم کی عاشق مزاجی اور مفاد پرستی کا یہ میل بظاہر عجب ہو تو ہو، درحقیقت بہت منطقی ہے۔ موجودہ اردو افسانے کی فضا پر چھائی ہوئی یہ گرد، پریشاں روزگاری اور آشفتہ سری خالص قبائلی ذہنیت کی غماز ہے اس میں عالمی تہذیب کے ارتقا کا عکس نظر نہیں آتا۔ دراصل ثقافت اور آفاقیت کے جواہر اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک نصب العین روحانی اور اخلاقی نہیں ہو اور ہنگامی مسائل کے بجائے ابدی قدروں کو مقصودِ عمل نہیں بنایا گیا ہو۔ جہاں فقط زر، زمین اور زن کی خالص مادی و معاشی تثلیث ہی کار فرما ہو وہاں خصبیت اور وحشت کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ پریم چند کے "میدان عمل" سے کرشن چندر کے "ایک عورت ہزار دیوانے" تک اردو افسانے نے قصہ گوئی میں شاید ترقی کی ہو تو کی ہو، ذہنی حرکت صریح طور سے مائل بہ تنزل ہے۔ (مذکورہ تخلیقات ناول کی صورت میں ہیں، مگر زیر بحث معاملے میں ناول اور افسانے کے درمیان کوئی فرق نہیں دونوں کا رجحان یکساں ہے)

جدید ترین افسانہ نگار ترقی پسند تحریک کے ساتھ ضابطے کا تعلق نہیں رکھتے۔ نہ اس تحریک کے ساتھ ان کی شعوری ہمدردی یا پسندیدگی ہے۔ بعض تو اس کے خلاف ردعمل پر آمادہ ہیں لیکن یہ واقعہ ناقابل انکار ہے کہ ان تمام افسانہ نگاروں پر اثر ترقی پسند روایت کا ہی ہے۔ اشتراکی عقائد سے ان کی وابستگی نہیں ہے۔ لیکن ان کی ذہنیت کے غالب عناصر وہ ہیں جو اشتراکی نظریۂ حیات کے لازمی و منطقی، گرچہ غیر محسوس نتائج ہیں۔ اشتراکیت کی بنا انسان کے معاشی مسائل پر ہے۔ غذا، لباس، جنس و مکان کے مسائل ہی اس کا مطمح نظر ہیں۔ سماج میں انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کی بنیاد، اشتراکی نقطۂ نظر سے یہی مسائل ہیں۔ چنانچہ ان ہی کے حل کی کوششوں سے حیات و کائنات کا ارتقا وابستہ ہے۔ ماحصل یہ کہ ایک مرد، ایک عورت کا ارتباط، اس سے پیدا ہونے والا ایک گھر، بچے اور رشتہ دار، ان سب کے درمیان پسندیدگی کا محور یہ کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے کی خالص انفرادی و جسمانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، ربط کے اس چکر میں ابھرنے والی محبت یا عشق بھی نتیجۃً خالص انفرادی مفاد کا پابند۔ گرچہ عشق بذات خود ایک رسم شکن جذبہ ہے اور اس کی وسعتوں اور بلندیوں کی کوئی حد نہیں، مگر جب شعور میں محسوس مادی پیکروں کی پرستش جاگزیں ہو جائے تو اچھے اچھے کوہ کن بھی اسیر خار رسوم و قیود ہو جاتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۰ پر)

ہماری زبان

۸ نومبر ۱۹۶۲ء

کرپلانی رپورٹ اور انجمن

جب سے کرپلانی رپورٹ کا خلاصہ اخباروں میں شائع ہوا ہے اُس کی مخالفت اور موافقت میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ صحیح رائے پوری رپورٹ پڑھ کر ہی دی جا سکتی ہے اور پوری رپورٹ ابھی تک شائع ہی نہیں ہوئی۔ مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ العلما ہند نے ایک مضمون میں انجمن سے اپیل کی ہے کہ وہ اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ایک نمائندہ کمیٹی بنائے۔ انجمن خود بھی اپنا یہ فرض سمجھتی ہے کہ اس رپورٹ پر غور کرے اور اردو دوستوں کو اپنی سوچی سمجھی رائے دے۔ چنانچہ نومبر کے آخر میں انجمن کی مجلس عام اس رپورٹ پر غور کرے گی۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں بہت سے مراسلات آئے ہیں، شاخوں نے کچھ قراردادیں بھی پاس کی ہیں۔ اس کے علاوہ قومی آواز میں حیات اللہ انصاری اور قاضی عدیل عباسی کے کئی مفصل مضمون اس کی موافقت اور مخالفت میں نکل چکے ہیں۔ پہلے خیال یہ تھا کہ جے پور میں کانفرنس کے موقع پر اس رپورٹ پر بھی غور کیا جائے، مگر اب چونکہ کانفرنس موجودہ ہنگامی حالات کی وجہ سے ملتوی ہو گئی ہے اس لئے انجمن کی مجلس عام اور مجلس عاملہ کو جلد سے جلد اس مسئلے پر اپنی رائے دینا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انجمن اس غرض سے کوئی نمائندہ کمیٹی بنائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک مناسب طریقہ کار ہوگا۔ یہ رپورٹ اچھی ہو یا بُری، اہم ضرور ہے۔ پہلی بار حکومت یو پی نے پوری ریاست میں اُردو کی پوزیشن پر غور کیا ہے اور اپنی تجاویز حکومت کے سامنے پیش کی ہیں۔

شری آچاریہ کرپلانی کے علاوہ کمیٹی کے اراکین میں اُردو اور ہندی کے چند ممتاز اشخاص بھی تھے انھوں نے کچھ سفارشات ایسی کی ہیں جو متفقہ ہیں اور خاصے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ انھیں سرسری طور پر ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کے حُسن و قبح پر اچھی طرح غور ہونا چاہئے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کمیٹی کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ کہاں تک اس نے انجام دیا اور اس کی تجاویز سے آئندہ کے لئے کیا راہیں کھلتی یا بند ہوتی ہیں۔ بہر حال اُردو دوستوں کو انجمن کی رائے کا ضرور انتظار کرنا چاہئے۔

انجمن کی شاخیں اور موجودہ ہنگامی حالات

چین کی فوجوں کے ہندوستان کی شمالی سرحد پر حملے سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس میں ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ سب سے پہلے وہ اس خطرے کے مقابلے کے لئے ملک میں نظم قائم کرنے کے لئے، فوجی تیاریوں میں مدد دینے کے لئے، لوگوں میں عزم و ہمت پیدا کرنے کے لئے، ہر ممکن قدم اُٹھائے۔ ہمیں یقین ہے کہ انجمن کی شاخوں کے تمام ممبر دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر اس قومی فریضے کو پورا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ روزمرہ زندگی کے سارے مسائل ختم نہیں ہو جائیں گے مگر اس وقت یہ خیال ضرور رہنا چاہئے کہ کوئی احتجاج یا ہنگامہ ایسا نہ ہو جس سے اس اہم کام میں ذرا بھی خلل پڑے۔ ہمیں ہر طرح اپنے وزیر اعظم کے ہاتھ مضبوط کرنے ہیں۔ انجمن کے ممبروں کو قومی محاذ کے لئے چندے بھی کرنے چاہئیں اور اُن تمام اسکیموں میں جو حکومت نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بنائی ہیں پوری طرح حصہ بھی لینا چاہئے۔ اس کے ساتھ اُردو کی بقا و ترقی کے لئے جو جو کام ہو رہے ہیں وہ بھی جاری رہنے چاہئیں۔ شاعر نے غلط نہیں کہا ہے:

درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق

اسٹائن بیک کو نوبل انعام

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اب کے ادب کا نوبل انعام مشہور امریکی مصنف جان اسٹائن بیک کو ملا ہے۔ اسٹائن بیک بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس کی کتابوں میں چوہے اور آدمی (OF MICE AND MEN)، برہمی کے انگور (GRAPES OF WRATH)، تارتلا فلیٹ TORTILLA FLAT زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم اسٹائن بیک کو اس انعام پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اُس نے اپنے ناولوں میں انسان دوستی کے جس گہرے جذبے کا ثبوت دیا ہے، کچلے طبقے کے کچلے ہوئے افراد کی عظمت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، چھوٹی چھوٹی مبتذل اور بے معنی باتوں میں جو معنی خیز حقائق کی کرنیں دیکھیں اور دکھائی ہیں وہ آئینہ خانوں کو شرماتی ہیں۔ جو نرمی، دلآسائی اور دلداری اُس کی ناولوں کے صفحات میں زندۂ جاوید ہو گئی ہے وہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس کے یہاں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ملتا مگر انسان کے ہر روپ اور ہر رنگ سے اس کی محبت اور زندگی کے ہر منظر سے اس کا عشق، اُس کو اچھا فن کار بنا دیتا ہے۔ ہماری زبان میں اس کے فن پر عنقریب ایک مضمون شائع ہوگا۔

انجمن ترقی اُردو ہلدوانی

انجمن ترقی اُردو ہند کی شاخ ہلدوانی نے طے کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی یاد میں ایک عام جلسہ اور مشاعرہ ۷ ؍ نومبر ۱۹۶۲ء کو منعقد کیا جائے جس میں بہادر شاہ ظفر کی جدوجہد آزادی اور قومی یکجہتی کے لئے انجمن پر روشنی ڈالی جائے۔

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (بہار)

۲۵ ؍ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو زیر اہتمام انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد اُردو داں طبقہ کا ایک جلسہ زیر صدارت ظہیر حسن خاں صاحب مختار منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر ذاکر کے انتقال پر تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔

ایک دوسری تجویز کے ذریعے جلسے نے سنہا کالج اورنگ آباد میں اُردو لکچرار کی ایک پہلے سے قائم شدہ جگہ کی منسوخی پر اپنی گہری تشویش اور رنج کا اظہار کیا اور کالج کی گورننگ باڈی کے اس اقدام کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ اور کالج کی گورننگ باڈی، یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین، وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی اور وزیر تعلیم ریاست بہار سے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً اس اہم تعلیمی و سماجی مسئلے کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں، اور اس کا ایسا حل نکالیں جو شہر کے اردو خواں طالب علموں اور ان کے سرپرستوں کے لئے قابل اطمینان ہو۔

بزم ادب، برنالہ ضلع سنگرور (پنجاب)

۱۶ ؍ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بزم ادب برنالہ کا ایک خصوصی جلسہ زیر صدارت سردار حورسنگھ لیکھوں منعقد ہوا جس میں مندرجۂ ذیل تجاویز باتفاق رائے پاس کی گئیں۔

(۱) پنجاب سرکار سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ صوبہ میں اُردو زبان کے حفظ و بقا کے لئے موثر اور فوری اقدام کرے۔ اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اُردو پنجاب کی سب سے زیادہ مقبول اور صوبہ میں سب سے زیادہ لکھی، پڑھی اور بولی جانے والی زبانوں میں سے ایک ہونے کے باوجود آج کل حکومت کی بے توجہی کا شکار ہے اور صوبائی حکومت اس کے تحفظ کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہی۔

(ب) مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند سے پُرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ پنجاب میں اُردو کے تحفظ کی فوری تجاویز عمل میں لاکر اپنی سابقہ طویل اور مسلسل کوتاہیوں کی تلافی کرے۔

اس حقیقت پر افسوسناک حیرت ظاہر کی گئی کہ باوجود مسلّم ہونے کے کہ پنجاب میں اُردو پر عرصۂ حیات تنگ ہے، انجمن اپنے فرائض سے لگاتار کوتاہی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ اگر انجمن نے اب بھی اس سلسلے میں غفلت برتی اور پنجاب میں اپنی شاخ کو سرگرم اور موثر بنانے میں کوئی خاص توجہ نہ دی تو اس کوتاہی کی وجہ سے انجمن ترقی اردو کا شمار بھی پنجاب میں اُردو کو مٹانے والوں کی صف میں کیا جائے گا۔

انجمن ترقی اُردو الٰہ آباد کا جلسہ

لسانی کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض

الٰہ آباد۔ ۲۳ ؍ اکتوبر۔ انجمن ترقی اُردو الٰہ آباد کا ایک جلسہ پروفیسر سید احتشام حسین کی صدارت میں روشن باغ الٰہ آباد ہوا جس میں لسانی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کیا گیا۔ اور مزید غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے کنوینر پروفیسر سید احتشام حسین مقرر ہوئے۔ ایک عارضی کمیٹی کی بھی تشکیل کی گئی جو کہ انجمن کی ممبرسازی کرکے ۲۰ ؍ نومبر کو انتخاب کرائے گی۔ یہ انتخاب مجیدیہ کالج میں ۲۰ ؍ نومبر کو ۴ بجے شام کو ہوگا۔

ڈاکٹر سین کا انتقال

یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۲۰ ؍ اکتوبر کو ملک کے نامور مورخ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔

ڈاکٹر سین متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور مغلیہ عہد کے مستند مورخ سمجھے جاتے تھے۔ آپ نیشنل آرکائیوز (نئی دہلی) کے سابق ڈائرکٹر اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر تھے۔ حکومت ہند نے "اٹھارہ سو ستاون" کی جو تاریخ شائع کی ہے اس کے مولف بھی ڈاکٹر سین ہی تھے۔

ہاروِن کے ایک ادبی کارکن کی وفات

یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۱۷ ؍ اکتوبر کو ہاروِن کے سرگرم ادبی کارکن عبدالرزاق کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم پانچ سال سے فالج کے مرض میں مبتلا تھے۔

انجمن ترقی اُردو ہاروِن کے زیر اہتمام جو مدرسہ جاری ہے، مرحوم ہی اس کے روح و رواں تھے۔

انجمن ترقی اُردو ادب شکر نگر

انجمن ترقی اُردو ادب شکر نگر (آندھرا پردیش) کے ایک ہنگامی جلسے میں چین کے جارحانہ حملے کی مذمت اور حکومت کے دفاعی اقدامات کی حمایت کرتے ہوئے ہر ممکن امداد کا اعلان کیا گیا۔

کوئٹہ میں ادبی سرگرمیاں

کوئٹہ ۲۰ ؍ اکتوبر۔ گزشتہ ہفتہ کوئٹہ میں ادبی سرگرمیوں کا اہم ہفتہ تھا ۱۵ ؍ اکتوبر کو میونسپل کوئٹہ کی جانب سے زیر اہتمام بزم ادب کوئٹہ ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ ... علی خاں صاحب ... کی صدارت میں ہوا۔ ۱۶ ؍ اکتوبر کو ... ہوا۔ شعراء کے اعزاز میں بزم ادب کوئٹہ کی جانب سے ایک شام ... زیر صدارت ... منعقد ہوا جس میں مقامی و بیرونی تمام شعراء کرام شریک تھے ۱۷ ؍ اکتوبر کو بزم ... کوئٹہ ... کی جانب سے ایک اعزازی نشست حضرت ... کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

آسی مانکپوری

میرا دل

اک بیابان نامرادی کا
آرزوؤں کا ایک ویرانہ
جس کا انجام درد، جس اک یک
میرا دل ایسا ایک افسانہ

جس کی قسمت میں کوئی ہونٹ نہیں
میرا دل ایسا ایک پیمانہ
جس کو ہر ایک نے فریب دیا
چاہے اپنا ہو چاہے بیگانہ
ہر قدم پر ملی جفا اس کو
کب ملی دولت وفا اس کو

کوئی راہی نہیں رہا جس کا
اس کو اک ایسی رہگزر کہیے
اک شبستان تیرہ و تاریک
اک خرابہ کہ اک کھنڈر کہیے
ایک ڈالی بغیر برگ و ثمر
ایک سوکھا ہوا شجر کہیے
ایک نالہ کہ جو رسا نہ ہوا
ایک فریاد بے اثر کہیے

اس شبستان تیرہ بختی میں
آج اک شمع جھلملائی ہے
بعد مدت کے اس خرابے میں
آج پھر زیست کسمسائی ہے

بعد مدت سے سرد ہونٹوں پر
آج ملتی ہے گرمیٔ گفتار
ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ پھر
روشنی تیرگی میں ہے پیکار

آج صحرائے خامشی میں مجھے
دوستو اک صدا سی آتی ہے
آج اس رہ گزار پر پھر سے
مجھ کو آوازِ پا سی آتی ہے

آج پھر اس اجاڑ مندر میں
آ رہا ہے کوئی حسین صنم
پھر سے نقش وفا بنانے کو
کسمسانے لگا ہے میرا قلم
اور میں ہاتھ جوڑ کر اس سے
التجا کر رہا ہوں میرے دل
کیا فراموش کر دیا تو نے
اپنے ماضی کے خونچکاں ایام

میرے پیارے مرے دل ناکام
بند کر لے ہر اک کواڑ اپنے
تاکہ آنے نہ پائے یاد امید
اور پھر سے جنم نہ لے پائیں
پچھلے قصوں کے دردناک انجام
میرے پیارے مرے دل ناکام

قطعات تاریخ وفات نوحؔ ناروی

(۱)

حکیم میرنؔ دہلوی

دنیا سے کوچ کر گئے افسوس آج نوحؔ
بدلی غم و ملال کی ہر دل پہ چھا گئی

تھے جانشین داغؔ وہ اس میں کسے کلام
خود روح داغؔ ہم کو خبر یہ سنا گئی

وہ طوطیٔ غزل وہ فصاحت کا بادشاہ
بلبل کو جس کی شیریں زبانی لبھا گئی

وہ شوخی و سلاست و بندش وہ سادگی
صد ہا مشاعروں میں جو طوفاں اٹھا گئی

شاعر تو تھے ہی وہ مگر انساں بھی خوب تھے
ہستی تھی ایک وضع جو اپنی نبھا گئی

افسوس وہ چراغ سخن ہو گیا خموش
تھی جس کے دم سے بزم میں رونق ضیا گئی

میرنؔ سنہ وفات یہ ہجری میں تم لکھو
کشتی حیات نوح کی ساحل پہ آ گئی

۱۳۸۲ھ

(۲)

بسملؔ رتلامی

ہر در و بام سے آتی ہے صدائے ماتم
ہائے ویران ہوا آج مکان اردو
اشک آنکھوں میں لیے کہتے ہیں شیدائے ادب
اٹھ چلا آہ خداوند زبان اردو

۱۳۸۲ھ

غزلیں

دانش فرازی

کون سی منزل تمنا ہے جانے وحشت مجھے کہاں لائی
پھوٹ کر تجھ سے مطمئن سا ہوں آبرو ہے نہ خوف رسوائی
سمٹے جاتے ہیں سُرمئی بادل کھل گئی زلف عنبریں کس کی
ٹوٹا جاتا ہے خواب قوس قزح کون لیتا ہے انگڑائی
دونوں پروردۂ فضائے چمن، پھر بھی یہ امتیاز کیا ہے
میرے حصے میں گریۂ شبنم، ان کے حصے میں گلشن آرائی

استاد گلاٹی

تمہارا غم سہارا ہو گیا ہے
تلاطم خود کنارا ہو گیا ہے
و مستی کا میں مشکور ہوں اب
تمہارا غم گوارا ہو گیا ہے
ادھر ان کی نظریں اٹھ گئی ہیں
جدھر تیرا اشارا ہو گیا ہے

حکم چند نیّر

اُردو کا رسم خط

جب کبھی کوئی رسم خط ضروریات زمانہ کے مطابق حاجت براری نہیں کرسکتا تو اس میں ترمیم و تنسیخ اور اصلاح کی جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا کہ تھوڑی بہت اصلاحوں کے بعد مروّجہ رسم خط حاجت براری کے قابل ہو جاتا ہے۔ اُردو کا رسم خط بھی انہیں حالات سے گزر چکا ہے۔ اگر پچھلے تین چار سو سال کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سرمائے کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں کئی اصلاحیں ہوئیں (جن کا اعادہ بیان غیر ضروری ہے) جس سے ہمارا رسم خط مختلف اصوات کو صحت کے ساتھ ضابطۂ تحریر میں لانے کے قابل ہو گیا اور کسی رسم خط کے مکمل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ وہ تمام اصوات کو صحت کے ساتھ ضبط کر سکے۔ مگر آزادی کے بعد حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں میں الفاظ کا لین دین بڑھتے چلے گئے ہیں اور تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اُردو میں بہت سے نئے الفاظ داخل ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اس لئے اردو کے رسم الخط اور املا میں اصلاح کی حاجت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ کچھ تجویزیں ایسی بھی ہیں جنھیں عملی جامہ پہنانا نہ صرف دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ دوسرے ممالک میں ایسے مسائل کو علمی اور عقلی حیثیت سے طے کیا جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں زبان اور اس سے متعلقہ مسائل پر گفتگو کرتے وقت لوگ علم و عقل کو بروئے کار لانے کے بجائے جذبات کی رو میں بہہ کر بہکی بہکی اور مضحکہ خیز باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات تو نیتیں وابستہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور موقع ملنے پر علم و ادب کی آڑ میں ذاتیات پر مبنی حملے کئے جاتے ہیں جو سراسر ایک غیر ادبی فعل ہے۔

رسم خط کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہم مروّجہ رسم خط میں کچھ ترمیم و تنسیخ اور اصلاح چاہتے ہیں یا موجودہ خط کو گشتنی اور گردن زدنی ٹھہرا کر کوئی اور رسم خط اپنانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ طے ہو جائے تو اُردو کے ارباب ہنر یکسوئی سے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کر سکیں گے اور کوئی صحیح و قابل قبول حل تلاش کر لیں گے۔ ورنہ بصورت دیگر تذبذب کے عالم میں جیسا کہ اب ہو رہا ہے کوئی رومن رسم خط کی مدح سرائی کرتا ہے تو کوئی ناگری لپی کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ کوئی موجودہ رسم خط کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو کوئی کسی نئے رسم خط کی ایجاد کا مشورہ دیتا ہے۔

ہر زبان ایک مخصوص رسم خط رکھتی ہے۔ صدیوں کے چلن اور استعمال سے یہ رسم خط زبان کے عناصر ترکیبی میں رچ بس جاتا ہے۔ اس طرح سے زبان اور اس کے رسم خط میں ایک قسم کی مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسم خط اور زبان کا تعلق گو بنیادی نہیں ہوتا لیکن یہ تعلق تعلق خاطر سے بھی کہیں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ رسم خط ہی بہت حد تک زبان کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کا ضامن ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان ایک مخصوص مزاج اور آہنگ رکھتی ہے اور ایک مخصوص لب و لہجہ۔ ہر زبان کی کچھ نہ کچھ اصوات دوسری زبانوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ یوں تو ہر زبان کے الفاظ کو کسی رسم خط میں لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کی مخصوص اصوات کی صحت کے ساتھ ادائگی صرف اس کے مروّجہ رسم خط میں ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس زبان کے لئے جو رسم خط استعمال کیا جا رہا ہے وہی اس کے لئے موزوں ترین بن جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صدیوں کے استعمال، چلن اور تحریر کی خراد پر چڑھ کر رسم خط زبان کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر موجودہ رسم خط کو ترک کرنے کا سوال حلقۂ اُردو کو اپنے دل و دماغ سے نکال دینا چاہئے کیونکہ اس قسم کی کوئی غلطی اُردو زبان کے لئے نہ صرف ضرر رساں بلکہ مہلک ثابت ہوگی۔ معمولی سے معمولی دل و دماغ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے مروّجہ رسم خط کو چھوڑ کر کوئی اور رسم خط اپنانا جان کی بازی لگانے کے مترادف ہے اور جان کی بازی لگا کر جان بچائے جانا ایک نہایت مشکل کاروبار۔

ہماری زبان کے ۱۵ اپریل والے شمارے میں ڈاکٹر محمد عقیل نے ایک تجویز پیش کی ہے۔ اور رومن رسم خط کو اُردو رسم خط کا نعم البدل بتایا ہے۔ ان کی تجویز کا خلاصہ انہیں کے الفاظ میں پیش ہے:

(۱) رومن رسم خط اختیار کرنے سے یقیناً بہت بڑی حد تک مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

(۲) سیدھے سادے طریقے سے رومن رسم خط اختیار کر لیا جائے۔

(۳) رفتہ رفتہ اعراب اور آوازیں بھی اپنا حل تلاش کر لیں گی۔

(۴) زبان عوام ہی بناتے ہیں اور اپنی دقتوں کا حل تلاش کرنا بھی جانتے ہیں۔

(۵) رومن رسم خط ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اُردو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی آسانی سے پڑھی اور سمجھی جا سکے گی اور اُردو کے ادیبوں کے لئے مغربی ممالک کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

(۶) میری بنائی ہوئی اسکیم محض وقتی ہے جس سے آگے چل کر زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ صرف پڑھنے لکھنے کی تھوڑی بہت دقتیں حل ہو سکتی ہیں۔

یہ ہے ڈاکٹر محمد عقیل کا موقف۔ رومن رسم خط کی تجویز کوئی نئی تجویز نہیں ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے بھی کچھ لوگوں نے ایسی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس وقت نہ صرف ہندوستانیوں بلکہ انگریزوں نے (جن کے لئے اُردو لکھنا پڑھنا ضروری تھا) ایسی تجویزوں کی مخالفت کی تھی۔ رومن رسم خط تو ابھی تک یوروپی زبانوں کو راس نہیں آیا۔ ہمارے ماحول اور لب و لہجہ کو کیونکر راس آ سکتا ہے؟ عقیل صاحب کا کہنا ہے "رومن رسم خط اختیار کرنے سے یقیناً بہت بڑی حد تک مسئلہ حل ہو سکتا ہے"۔

موصوف کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ایک طرف تو وہ یقین سے کہتے ہیں کہ مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن دوسری طرف مسئلہ کا حل پوری طور پر نہیں بلکہ صرف بہت بڑی حد تک ہوگا۔ ایسے مبہم اور متضاد خیالات سے عقیل صاحب کا مطلب کیا ہے؟ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

ہمارے خیال میں رومن رسم خط اپنانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ جن مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے رومن رسم خط کو اپنانے سے سیکڑوں نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر عقیل اس بات کے قائل ہوں کہ ع

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اردو میں رومن رسم خط کا تجربہ ہو چکا ہے۔ کئی کتابیں چھاپی گئیں۔ ایسی کتابوں کا پڑھنا ایک اچھے اردو داں کے لئے بہت مشکل ہے تو غیر اردو داں کیسے پڑھ سکتے ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں نہ صرف وقت، جگہ اور محنت زیادہ صرف ہوئی بلکہ اردو کے الفاظ بھی صحت کے ساتھ تحریر نہ کئے جا سکے اور کتاب کی کتاب لفظی التباسات کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔ علاوہ ازیں مروجہ رومن رسم خط۔ ط، ت، ٹ، د، ڈ، ذ، ز، ض، ظ، س، ث، ص، ح، ھ، خ، کھ، گھ، غ، ڑ، ڑھ، ا، ع، ء، ن اور نون غنہ وغیرہ حروف اور اصوات کے لئے صرف ایک حرف کو لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ باقی ماندہ اصوات کے لئے ہمیں کتنے نئے حروف وضع کرنے پڑیں گے۔ نئے حروف وضع کرنے اور پھر اس نئے رسم خط میں اردو کے تمام سرمائے کو نہ سہی صرف ادب العالیہ (کلاسیکل) کو منتقل کرنے کے لئے عمرِ خضر کی ضرورت ہے سیدھے سادے طریقے سے رومن رسم خط کو اپنانے سے کس قدر دشواریاں بڑھ جائیں گی اس کا اندازہ قارئین کو ہو گیا ہوگا۔

جہاں تک اعراب کا تعلق ہے میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ جس قدر اعراب اردو کے لئے موجود ہیں کیا انھیں پابندی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا ہم نے کچھ اضافے کرکے انھیں مکمل کرنے کی کوشش کی؟ جب موجودہ رسم خط میں چند نئے اعراب کا اضافہ نہیں ہو سکتا تو یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ رومن رسم خط اپنی آوازوں اور اعراب کو خود تلاش کرے گا۔ میرے خیال میں تو ع این خیال است و محال است و جنوں۔

آگے چل کر عقیل صاحب فرماتے ہیں کہ زبان عوام ہی بناتے ہیں اور اپنی دقتوں کا حل بھی تلاش کرنا جانتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کا ایک حصہ عوام بھی بناتے ہیں لیکن زبان کی مشکلات کا حل عوام نہیں تلاش کر سکتے۔ یہ کام خواص سے اور صرف خواص سے ہو سکتا ہے۔ عوام تو لکھنؤ کو لکھلؤ بنا کر اپنی مشکل حل کر لیتے ہیں، کیا ادبیات میں بھی لکھلؤ لکھ کر گزر بسر ہو جائے گی؟ دوسری بات یہ ہے کہ زبان کی جس ابتدائی اسٹیج پر زبان کی ساخت و پرداخت میں عوام کا ہاتھ ہوتا ہے اردو زبان اس اسٹیج سے گزر چکی ہے۔ اب اس کی تعمیر و ترقی میں ادیبوں کا ہاتھ ہے۔

عقیل صاحب نے اردو زبان کے علاقے کی وسعت کا خوش آیند فریب دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے اتنی بات کہنے سے پہلے غور و فکر سے بالکل کام نہیں لیا۔ رومن رسم خط دنیا کی کئی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کیا رومن حروف سیکھ لینے کے بعد یہ تینوں زبانیں پڑھی جا سکتی ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ ہندوستان میں لاکھوں اشخاص انگریزی پڑھنا لکھنا جانتے ہیں لیکن فرنچ اور جرمن سے بالکل نابلد ہیں حالانکہ ان دونوں زبانوں کا رسم خط بھی رومن حروف سے بنا ہے۔ اگر ڈاکٹر عقیل نے کوئی ایسا تجربہ کیا ہو تو وہ اپنے تجربات سے ہمیں بھی مستفید فرمائیں۔

سب سے دلچسپ بات جو ڈاکٹر عقیل نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ "میری بتائی ہوئی اسکیم محض وقتی ہے۔ جس سے آگے چل کر زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ صرف لکھنے پڑھنے کی تھوڑی سی وقتیں حل ہو سکتی ہیں۔" خوب کہی صاحب ع ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ ایسی محض وقتی اسکیم کو اپنا کر بے چاری اردو پر کیا گزرے گی؟ یہی نہ کہ بے چاری اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گی اور اس کے واحقین و متعلقین کو کہنا پڑے گا کہ "انا للہ و انا الیہ راجعون" یہ 'مزاح المومنین' نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر عقیل نے اسی مراسلہ میں ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "ہندی انگریزی الفاظ اور اردو املا" کو "مزاح المومنین" اور استادانہ قلابازیوں سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اردو زبان کے لئے کوئی رسم خط تجویز نہیں کیا تھا جس سے ڈاکٹر عقیل چیں بجبیں ہو گئے۔ میرے خیال میں تو ڈاکٹر عقیل ایسے پڑھے لکھے آدمی کے منہ پر ایسے نازیبا کلمات کچھ زیب نہیں دیتے۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اردو لسانیات اور صوتیات پر پچھلے دو تین سال میں وقیع کام کیا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اربابِ ہنر ہی کر سکتے ہیں ہر بوالہوس و جمن نہیں۔

مراسلات

در جواب آں نظم — "یادیں"

"ہماری زبان" مورخہ ۸ر اکتوبر میں، میری نظم "یادیں" پر محترم سجاد ظہیر صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد (۲۶ر اگست) میں ادارہ کے نوٹ کے ساتھ سجاد ظہیر صاحب کی نظم "بخشش" شائع ہوئی اور اس کے دوسرے ہی دن میں نے بیٹھے بیٹھے چند ثانیوں میں اُن کی نظم کو بحر میں منتقل کرنے کی کوشش کی، ابتدائی چند لائنیں اس کا ثبوت ہیں۔ ویسے موضوع کے لحاظ سے ہماری نظموں میں کافی اختلاف ہے جسے محترم سجاد ظہیر صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔

نظم "یادیں" محض اس جذبے کے تحت وجود میں آئی ہے کہ "بخشش" ایسا "بے بحر" تجربہ ہندی شاعری کے لئے تو سہل ہو سکتا ہے مگر اُردو میں ناقابل قبول ہے۔ اس نظم کو اشاعت کے لئے بھیجتے وقت میں نے "بنّے بھائی کی نظم سے متاثر ہونے اور اس کے ابتدائی حصّے کو من و عن بحر میں منتقل کرنے کا مختصر نوٹ بھی لکھ دیا تھا، ایسا خیال پڑتا ہے۔

ویسے یہاں کے کئی احباب کو یہ نظم اس حوالے اور تجربے کے ردعمل کی تصریح کے ساتھ سُنا چکا ہوں۔ نظم "یادیں" میرے لئے "ذریعۂ عزت" نہیں ہے۔ اگر اس نظم سے ہماری تحریک کے سربراہ و میرے محتشم بزرگ سید سجاد ظہیر صاحب کو اذیت پہنچی ہو تو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس نظم کو اپنے "سرمایۂ سخن" سے خارج کرتا ہوں اور بس۔

(وقار خلیل بسلطان شاہی حیدرآباد ۲)

بس اتنی سی بات ہے کہ ناول ہمارے ناولیں تمہاری

۱۵ر ستمبر ۶۲ء کے "ہماری زبان" میں ناول اور ناولٹ کی تذکیر و تانیث پر اصول زباندانی سے آزادانہ بحث نظر سے گذری، اس لئے اس پر ایک طالب علمانہ تبصرہ پیش کرتا ہوں تاکہ نوآموزانِ ادب غلط فہمی سے دور اور قواعد کے حصارِ عافیت میں محفوظ و مسرور رہیں۔

بحث مذکور میں عتیق احمد صاحب صدیقی تذکیر کے حامی ہیں اور گوردیال سنگھ صاحب بھولا ایڈوکیٹ نیو دہلی تانیث کے وکیل ہیں، صدیقی صاحب کا یہ کہنا کہ جمہور ان دونوں لفظوں کو مذکر ہی بولتے ہیں اگرچہ بعض مصنفین نے انھیں مونث بھی استعمال کیا ہے ایک حد تک درست ہے لیکن اس امر سے کہ "بعض مصنفین حالت فاعلی میں ناول کی جمع ناولیں لکھتے رہے ہیں" یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ "ان کی جمع بھی مختلف فیہ ہی ہیں اور پھر اس پر مزید ترقی کرنا کہ "ساعت پر یہ بار گراں ہوتا ہے" ضرور نہیں کہ ہر لفظ کی جمع بنائی جائے (کیونکہ ہمارے یہاں ایسے الفاظ کی بڑی تعداد ہے جو حالت فاعلی میں واحد اور جمع میں یکساں طور پر بغیر کسی تبدیلی کے استعمال ہوتے ہیں مثلاً آدمی، قاضی، ہاتھی، بادل، دریا، پھول، گل، چمن، وغیرہ" یہ سب باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اس اختلاف جمعیت کو مستقل اور جداگانہ اختلاف سمجھ رہے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے، (۱) بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ تانیث کے قائل ہیں وہ "بلبل" کی طرح اس کی جمع ناولیں ہی بولتے ہیں اور جو تذکیر کے قائل ہیں وہ "مرد" کی طرح اس کی جمع ناول ہی بناتے ہیں، کیونکہ اُردو میں جمع بناتے وقت واحد کی تذکیر و تانیث پر بھی نظر رکھی جاتی ہے، مذکر اسماء کے لئے ایک قاعدہ ہے تو مونث اسماء کے لئے دوسرا، پس یہ اختلاف جمعیت متفرع ہوا ناول کی جنسیت کے اختلاف پر، لہٰذا یہ کوئی مستقل اختلاف نہیں، (۲) اور الفاظ مذکورہ جو صدیقی صاحب نے پیش کئے ہیں بالاتفاق مذکر ہیں، لہٰذا ناول کا اُن پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ یہ مختلف فیہ ہے، (۳) پھر حالت فاعلی کی قید بھی صدیقی صاحب نے غلط لگائی کیونکہ حالت فاعلی میں بھی ان مذکر اسماء کی دوسری شکل (بجز دریا کے جو مستثنیٰ ہے، چچا، ماما، دادا، کی طرح) یہ بھی ہے۔ کہ "مردوں نے کہا،" "ناولوں" نے یہ اخلاقی سبق دیا، ہاں یوں کہیے کہ جب یہ الفاظ مبتدا یا خبر ہوں جس کی عمدہ مثال اسی مضمون کا عنوان ہے تو اصحاب تذکیر و تانیث لف و نشر مرتب کے طور پر یہ کہیں گے "ناول ہمارے، ناولیں تمہاری"۔

اب ایڈوکیٹ ممدوح کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ آپ اسے مونث استعمال کریں، آپ مختار ہیں، بعض فصحا نے بھی ایسا ہی کیا ہے، (۱) لیکن اس کی تانیث کو واجب قرار دینا اس بنا پر کہ وہ فرانسیسی لفظ ہے اور فرانسیسی میں مونث استعمال ہوتا ہے حدودِ قانون سے تجاوز ہے، ہمیں تو فصحائے اُردو کا روزمرہ دیکھنا ہے نہ کہ اہل فرانس کا، خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "شمس" عربی ہے اور عربی میں ہمیشہ مونث لیکن اُردو میں ہمیشہ مذکر، اسی طرح "یہ بیضا" عربی میں بالاتفاق مونث اور ہمارے یہاں بالاتفاق مذکر، (۲) پھر آپ کی دوسری دلیل کہ ناول مونث تو اس کا اسم تصغیر ناولٹ بھی مونث ہونا لازم خلاف قانون ہے، پنکھا مذکر لیکن پنکھیا مونث، لوٹا مذکر، لیکن لُٹیا مونث، (۳) اور لطف تو یہ ہے کہ آپ وکالت تو اس کی تانیث کی فرما رہے ہیں اور خود اُسے مذکر بولتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ "ناول کے معنی چھوٹا اور مختصر ناول کے ہیں" یہ "چھوٹا" مونث نہیں تو کیا آپ صدیقی صاحب سے مل گئے! (۴) بہر حال اس باب میں آپ کی جانب سے فرانسیسی اور انگریزی کتب لغات کی شہادت اُردوئے معلّیٰ کی عدالت عالیہ میں قابل سماعت نہیں کیونکہ سہ

ہم سند کے لئے لغت ہیں امیرؔ
فصحا کی زبان سے لیتے ہیں!

(مصطفیٰ علی گڑھ)

مردان علی خاں نظام

(۱) ہماری زبان کا شمارہ ۲۱ : ۴۰ ، تاریخ ۲۲ر اکتوبر ۶۲ء موصول ہوا، جس میں جناب ناؔدم سیتاپوری کا مضمون "مردان علی خاں رعنا (تلمیذ غالب)" شائع ہوا ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ میں نے ان کے حالات اپنی تالیف تلامذۂ غالب میں شامل نہیں کئے، اور اس پر وہ تعجب کرتے ہیں کہ رعنا مرحوم "نہ جانے کس طرح جناب مالک رام کی محققانہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔"

کار دنیا کسے تمام نکرد۔ تلامذۂ غالب میں بھی دوسرے تحقیقی کاموں کی طرح خامیاں ضرور ہوں گی۔ بعض احباب نے اس سے متعلق مضامین بھی لکھے ہیں، بلکہ لوگوں نے جلے دل کے پھپھولے بھی پھوڑے ہیں۔ میں نے دانستہ آج تک اس سے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اس کا باعث یہ نہیں تھا کہ میرے پاس ان مہربانوں کے متعدد اعتراضوں کا جواب نہیں تھا، بلکہ اس لئے کہ مولف کا کام ہے اپنی سی پوری کوشش کر کے، دیانت داری سے، موضوع سے متعلق پوری معلومات فراہم کرنا۔ اس کے بعد یہ اہل نظر کا کام ہے کہ اس کے حسن و قبح سے بحث کریں۔ ہر ایک کا حق ہے کہ وہ جو رائے چاہے، قائم کرے۔ مولف آخر کہاں تک لوگوں سے بحث کرتا پھرے! یہی وجہ تھی کہ میں خاموش رہا۔

ناؔدم صاحب کے مضمون پر بھی میں غالباً خاموش ہی رہتا لیکن اس سے ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے۔

مردان علی خاں نے اپنی عمر میں تین تخلص اختیار کئے۔ مضطر، رعنا، نظام؛ آخری تخلص نظام تھا۔ چنانچہ میں نے ان کا ترجمہ تلامذۂ غالب میں نظام تخلص ہی کے تحت درج کیا ہے (ص ۲۸۱ - ۲۸۴)۔ ناؔدم صاحب کو جس پر تعجب تھا، مجھے ان پر ہے۔ نہ صرف ان کے حالات ہی شامل کتاب ہیں، بلکہ ان کی تصویر بھی۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء — مالک رام [illegible]

(۲) ۲۲ر اکتوبر ۶۲ء کے "ہماری زبان" میں مردان علی خاں رعنا پر میرا جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے بارے میں ایک کرم فرما نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ تذکرہ "تلامذۂ غالب" میں مردان علی خاں کا ذکر "ن" کی ردیف میں "نظام" کے تحت کافی تفصیل سے موجود ہے اور ان کی تصویر بھی شامل تذکرہ ہے۔ تذکرہ "تلامذۂ غالب" افسوس کہ میرے پاس سے ضائع ہو گیا۔ مضمون لکھتے وقت میرے سامنے صرف وہ فہرست تھی جو جناب مالک رام کی فرمائش پر میں نے اس لئے تیار کی ہے کہ تذکرہ کے دوسرے ایڈیشن کے لئے ضروری یادداشتیں لکھتا ہوں اور اگر کوئی کام کی چیز مل جائے تو دوسرے ایڈیشن میں اس کا اضافہ کر دیا جائے۔ اپنی اس لاشعوری غلطی پر میں جناب مالک رام سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے صرف اپنی یادداشت پر بھروسہ کر کے یہ کیوں لکھ دیا کہ مردان علی خاں رعنا کا ذکر "تلامذۂ غالب" میں نہیں ہے۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء (ناؔدم سیتاپوری)

"اردو مجلس حیدرآباد" کا ماہانہ ادبی جلسہ

حیدرآباد۔ ۲۹ر اکتوبر۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۸ر اکتوبر کو شام کے ۶ بجے "اردو ہال" واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر راج کشور پانڈے ریڈر شعبۂ ہندی جامعہ عثمانیہ نے صدارت کی۔ مسٹر غلام ربانی نے "کھڑی بولی" پر اپنا تحقیقی اور عالمانہ مضمون سنایا اور تاریخی و لسانی ماخذات کے حوالوں سے کہا کہ "ہندوستان میں طرح طرح کی زبانوں اور بھانت بھانت کی بولیوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے اور ہر بارہ کوس پر پانی اور وانی بدل جاتے ہیں، یہ کہاوت دہلی پر پوری اترتی ہے جو ہریانی، برج، میواتی اور کھڑی بولی کا سنگم ہے اور یہ چاروں زبانیں الگ الگ روپ میں بھی اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ماں جائی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔" کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر غلام ربانی نے کہا کہ "کھڑی بولی جس علاقے میں بولی جاتی ہے اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ برج بھاشا والوں نے حقارت کے طور پر اس کو کھڑی بولی کہنا شروع کیا۔ جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یہاں یہی زبان اپنے قدیم رنگ روپ میں موجود تھی مگر اس کا کوئی نام نہیں تھا، مسلمانوں نے اس کو "دہلوی" کہا، یہ زبان گجرات میں گجری، دکن میں دکنی، ہندی اور ریختہ بھی کہلائی۔" کھڑی بولی کے مولد و مسکن اور اس زبان کے ادب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اور عہد بہ عہد کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر غلام ربانی نے کہا کہ "کھڑی بولی مغربی روہیلکھنڈ اور دوآبہ کے شمالی حصے میں رائج تھی جس میں مرادآباد، بجنور، میرٹھ، مظفرنگر اور سہارنپور کے ضلع شامل تھے۔ دہلی اور گوڑگاؤں کا مشرقی حصہ بھی اس کے رقبہ میں شامل تھا۔ اس کے رواج دینے میں صوفیوں اور درویشوں کا بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ کھڑی بولی کی نثر کی پہلی کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔ اس زبان کو اس بات کا بھی امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس کی شاعری کی ابتدا بادشاہوں سے ہوئی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے فرمانرواؤں کا بیشتر کلام اسی بولی میں ملتا ہے۔" محفل شعر و سخن میں مسرز متین سروش، حکیم یوسف حسین خاں، طالب رزاقی، ریورنڈ ریحانی، خورشید نذیر، وقار خلیل، مسافر لکھنوی، صلاح الدین نیر، کرن پرشاد کرن، فیض الحسن خیال، ناز حیدر، نظم کرنولی اور یار جامی نے تازہ کلام سنایا۔ ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے صدارتی تقریر میں کہا کہ "کھڑی بولی کا پہلا شاعر امیر خسرو ہے ان سے پہلے کھڑی بولی کے دو شاعر شرف الدین بوعلی شاہ قلندر اور بابا فرید شکر گنج بھی گزرے ہیں۔ شیخ فانی تانی کی تحریروں میں بھی کھڑی بولی کے اثرات ملتے ہیں۔" اردو اور ہندی کا ادب ملی جلی زبان میں ہو تو زیادہ فروغ پائے گا اور اہم ادیبوں کو اس طرف توجہ کرنے کی آج کے حالات میں سخت ضرورت ہے۔

([illegible])

بقیہ

اُردو افسانے کا ایک رُخ

چند معصوم انسانی جذبات جن کی بنیادی اہمیت اور فطری مطالبے سے انکار ممکن نہیں صرف قابلِ تسلیم و تشفی نہیں رہ جاتے ان سے شیفتگی پرستش کی حد تک بڑھ جاتی ہے، باپ کی شفقت ماں کی محبت، بھائی کا انس، بہن کی فدائیت اور محبوب کا عشق انسانیت کی بقا و ارتقا کے بلند مقصود کے وسائل ہونے کی بجائے خود مقصود بن جاتے ہیں، تصور کی اس بنیادی کجی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اپنے کنبے کے لئے زیادہ سے زیادہ آسائش کا حصول ہی تمام آرزوؤں کا مرکز بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں جب کوئی دشواری پیش آتی ہے تو تمنائیں مجروح ہو جاتی ہیں، فن کار کے نازک دل پر چوٹ پڑتی ہے اور وہ عجیب عجیب طریقوں سے سماج اور اس کے ان تمام اداروں کے خلاف فریاد کرنے لگتا ہے جو اسے اپنی راہ میں مزاحم نظر آتے ہیں۔

یہ گھریلو پن اور کنبہ پروری بظاہر ایک بہت معصوم چیز ہے۔ اس کی اپنے حدود میں اہمیت اور افادیت بھی مسلم، لیکن اپنے حدود سے بڑھ کر یہی چیز کاروانِ ارتقا کے لئے زنجیر پا بن جاتی ہے۔ انفرادیت کوشی اور خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے، ذہن سمٹ جاتا ہے اور نظر تنگ ہو جاتی ہے۔ بلند تر آفاقی قدروں کی سوچ اور پاسداری کے لئے ذہن و ضمیر آمادہ نہیں ہوتے معاشرہ بڑھنے اور پھیلنے کی بجائے سکڑنے لگتا ہے۔ قبائلیت اور وحشت کے عناصر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ فکر میں ندرت اور عمل میں جرأت نہیں رہ جاتی، مصلحت اندیشیوں کے سبب سرفروشی اور ایثار کی قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔

اس وقت اُردو افسانے کا فکری سرمایہ ایسا ہی کچھ کم معلوم ہوتا ہے کہ افسانے سے انتہائی شغف کے باوجود ہمارے لکھنے والوں نے ابھی تک اس کے صحیح مقام کو پہچانا نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس کی اہمیت شاید اسی قدر ہے کہ لوگ وقت گزاری کے لئے دلچسپ قصوں سے جی بہلا لیا کریں۔ ادب کا یہ تفریحی نقطۂ نظر کسی بھی صنف کے لئے غلط اور مہلک ہے۔ شک نہیں کہ فن کی ظاہری اپیل انبساط ہے، لیکن مجموعی تاثر بصیرت کی شکل میں ہی قابلِ وقعت ہو سکتا ہے۔ یہ بات نظم اور مقالے کے لئے جتنی صحیح ہے اتنی ہی ناول اور افسانے کے لئے بھی۔ اُردو نظم اگر ایک اقبال کے قالب میں فکر و فن کے عروج پر پہنچ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا ہی کمال اُردو افسانے کو حاصل نہیں ہو۔ اسی وقت اُردو افسانہ دنیا کے تہذیبی ارتقا میں ایک مستقل سرمایہ کی حیثیت سے شامل ہو سکتا ہے۔ مغرب کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر دنیا کو ایشیائی روح کی طمانیت سے بہرہ مند کر سکتا ہے، گوئٹے نہ سہی، کسی لالسطائی کا جواب پیش کر سکتا ہے۔ کرشن چندر اور منٹو زیادہ سے زیادہ چیخوف اور موپساں تک پہنچ سکتے ہیں۔

'پیامِ مشرق' پیش کرنے کی حیثیت میں آنے کے لئے ہمارے ان افسانہ نگاروں کو عملی سطح سے اور تفکر سے کام لینا ہو گا، تبھی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بصیرت اور سوز و گداز پیدا ہو جو کسی دانائے راز کو سراپا روزگار بنا دے۔ اس وقت ہمارے سماج کو اس آگہی اور جرأت کی شدید ضرورت ہے۔ مقبولِ عام ہونے کے سبب اُردو افسانہ ہمارے سماجی استقلال اور تہذیبی ارتقا میں نہایت موثر رول ادا کر سکتا ہے، بشرطیکہ فن کار سہل انگاری چھوڑ کر جگرکاوی کے لئے آمادہ ہوں۔

ڈاکٹر سیّد محمد عقیل

معصومہ

(عصمت چغتائی کا ایک ناول)

حال ہی میں عصمت چغتائی کا یہ تیسرا ناول نیا ادارہ لاہور پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ کتاب ٹائپ میں بہت خوبصورت چھپی ہے۔ گٹ اپ وغیرہ بہت اچھا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے خاندان کی داستان ہے جس کے تمام مرد، حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے جاتے ہیں اور تمام عورتیں مع ایک طفلِ شیر خوار کے حیدرآباد میں اس امید پر چھوڑ دی جاتی ہیں کہ پاکستان پہنچ کر معقول انتظام کر لینے کے بعد انھیں بلا لیا جائے گا مگر وہاں پہنچنے کے بعد خاندان کے سرغنہ نواب صاحب اور ان کے لڑکے اچھی اچھی جگہوں پہ ملازم ہونے کے بعد سب اپنی اپنی شادیاں کر لیتے ہیں اور ان افراد کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں جو حیدرآباد میں چھوڑ دیے گئے تھے اور جن میں تین لڑکیاں، ایک لڑکا سلیم اور ان بچوں کی ماں بیگم صاحبہ شامل ہیں۔ بیگم پہلے تو حیدرآباد میں بچے کھچے زیورات (جو نواب صاحب نہیں لے جا سکے) بیچ کر گزر بسر کرتی ہیں لیکن جب تمام اثاثہ ختم ہو جاتا ہے تو بجائے پاکستان جانے کے بمبئی چلی جاتی ہیں جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بمبئی میں ہر چیز کی قیمت بازار سے نسبتاً بہت زیادہ لگتی ہے (گویا پہلے ہی سے بیگم کے ذہن میں لڑکیوں کا دھندا کرنے کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے) یہاں ان کی بڑی لڑکی معصومہ کچھ تنگ دستی اور کچھ بڑھتے ہوئے فیشن اور اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ماں کی کوششوں سے عصمت فروشی کا دھندا شروع کر دیتی ہے۔ اور سیٹھ احمد بھائی سے ابتدا کر کے دوسرے سیٹھوں کا کھلونا بنی رہتی ہے جیسے کچھ دنوں کے بعد ایک راجہ صاحب دلی اُچک لے جاتے ہیں اور اس طرح گھومتے پھرتے پھر بمبئی واپس آتی ہے اور چرچ گیٹ کے پیچھے کہیں بظاہر بڑے آرام و چین سے زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔ یہیں ناول ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں بہت سے واقعات اور اشارے فلمی دنیا سے متعلق آتے ہیں جو بے جا تفصیل کی وجہ سے اکثر قصّے سے اس قدر الگ ہو جاتے ہیں کہ ناول کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ناول میں روپیہ ہندوستانی دولت کی طرح لاپروائی سے خرچ ہوتا رہتا ہے اسی طرح بمبئی کی زندگی میں ہر گوشے پہ فلم کی بے ڈھنگی اور بھدی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

یہ ناول "ٹیڑھی لکیر" کے بعد تقریباً ۱۰ سال کے وقفے پر لکھا گیا ہے۔ اس درمیان میں اُن کا شعور بہت بالیدہ ہو چکا ہے جس کی شہادت ان کے افسانوں سے ملتی ہے مگر "معصومہ" اس لحاظ سے بڑا مایوس کن ثابت ہوا۔ قصّہ بھی طرح اُٹھایا گیا تھا مگر سنبھل نہ سکا اور بعض ایسی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن کی امید مبتدیوں سے بھی نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ ایسی فن کار۔ دو ایک مثالیں ہمارے اس خیال کی وضاحت کریں گی۔ صفحہ ۱۰ پر ایک عبارت ملاحظہ ہو:۔

"بیگم صاحبہ نہ بیٹوں کی شادیوں کی خبر سن کر جلیں
دشمنوں کے آنے پر روئیں۔ جو کچھ میاں چھوڑ گئے تھے
وہ کچھ دن کام آیا... بچوں کے زیور بھی پیٹ کی کھیتی
میں اُتر گئے۔ کون تفصیل میں جائے؟ کچھ ہوا ہی ہو گا کہ
وہ بستر بوریا سمیٹ کر بمبئی آگئیں۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر بیگم کو حیدرآباد میں ہی ملی پھر کچھ دنوں تک وہ اپنے زیورات بیچتی رہیں اور ان پر گزر اوقات ہوتی رہی۔ کتنی مدت گزری اس طرح سے۔ اس کا پتہ ناول میں نہیں چلتا۔ تاہم اس کے بعد جب گزران کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تو وہ بمبئی آگئیں۔ اس کے بعد صفحہ ۲۰ پر یہی خبر بمبئی میں انھیں ملتی ہے جبکہ وہ احسان صاحب کے ساتھ رہ رہی ہیں اور یہاں بھی رہتے ہوئے دو سال گزر چکے ہیں۔ اس خبر نے دوسرا اثر یہاں دکھایا ہے۔ حیدرآباد میں اس خبر نے ان پر کچھ اثر نہیں کیا تھا۔

"مگر جس چیز نے بیگم کی کمر توڑ دی وہ شوہر کے
بیاہ کی خبر تھی۔ بڑے میاں نے اُنیس برس کی کومل
سی لونڈیا سے نکاح پڑھوا لیا اور بیگم کو وقتِ ضرورت
طلاق دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس دن وہ پہلے تو کمرہ بند
کر کے روتی رہیں پھر اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، چوٹی کی
اور خانساماں کو احسان صاحب کے پاس بھیجا، خانساماں
بھی آڑا ہوں دکھانے لگا تو انھوں نے زور کی ڈانٹ
بتائی کہ بھاگ بے جاہل۔ اسے کیا معلوم چند گھنٹوں میں
بیگم کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھیں۔"

دوسری مثال دیکھئے۔ ناول کے اختتام کے قریب ایک بوڑھے ڈنر دیا گیا ہے جس میں راجہ صاحب اور ان کے بہت سارے ملاقاتی ہیں۔ وہ بڈھا کرنل بھی ہے جو نیلوفر یعنی معصومہ کے عشق میں گرفتار ہے اور اسی کی وجہ سے راجہ صاحب کو بہت سے جھٹکے دلاتا ہے۔ یہاں کا ایک سین دیکھئے:۔

"نیلوفر ترنگ میں آئی ہوئی تھی۔ کرنل صاحب اس
کی پلیٹ میں مرغ کی آٹھویں ٹانگ لا کر اس کی گردن
پر گیلی گیلی پھنکاریں مار رہے تھے۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ نیلوفر گوشت اطمینان سے کھا رہی تھی اور اگر سات ٹانگیں نہیں تو کم از کم کچھ ضرور کھا چکی تھی۔ ورنہ کرنل کا آٹھویں ٹانگ اس کی پلیٹ میں رکھنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بوٹے جاری ہے کہ پھر یہ اطلاع ملتی ہے۔

"نیلوفر خالی پلیٹ سے مقفل پینے میں مشغول تھی۔ بوٹے
کی میز کی طرف دیکھتے ہی اسے ابکائی آنے لگتی۔ دھانے

"کیوں نیلو فر کو شبہ ہو گیا تھا کہ گوشت ضرور کتے کا ہے
... ترکاری تک میں اسے انسانی آنکھیں اور دانت
نظر آ رہے تھے۔"

تیسری مثال دیکھئے۔ پونا کے ہوٹل میں نیلو فر ضمیر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔

"اس رات نیلو فر نے کئی اور سیڑھیاں پھلانگ
ڈالیں۔ ضمیر کے زیر سایہ اس نے ان فلموں سے فن
سیکھا۔ پہلی مرتبہ گانجے کی سگریٹ پی اور مورفیا کا
انجکشن بھی آزمایا۔" صفحہ ۱۹۶

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے اس نے گانجے اور دھتورے کے سگریٹ نہیں پیئے تھے اور نہ مورفیا کا انجکشن لیا تھا۔ اور اس کے بعد راجہ صاحب سین پر آتے ہیں، مگر اختتام کے قریب صفحہ ۲۷۵ پر اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:۔

"اب شراب کے علاوہ اسے اور سارے نشوں کی
لت پڑ گئی تھی۔ پینا تو احمد بھائی سکھا گئے تھے۔
دھتورے کے سگریٹ اس نے سورج مل سے سیکھے،
کوکین کے انجکشن کا تحفہ راجہ صاحب نے دیا۔"

اسی طرح کے اور بہت سے تضاد ملتے ہیں جو ناول نگار کی جلد بازی اور لاپرواہی کا ثبوت ہیں۔

ناول کی بنیاد بھی کسی حد تک ناقابلِ یقین واقعے پر رکھی گئی ہے جو ممکن ہے کہ صحیح ہو مگر عام طور سے ان حالات میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ نواب اور ان کے لڑکوں کا اپنے خاندان کے اُن افراد کو یک قلم فراموش کر دینا جب کہ وہ کسی معاشی بحران کا شکار بھی نہ تھے عجیب و غریب ضرور ہے۔ جاگیردارانہ طبقے کی ذہنیت کا ایسا مظاہرہ زیادہ حقیقی نہیں ہے۔

راجہ صاحب سے ملاقات ہو جانے کے بعد ناول میں کچھ تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ گو یہ ملاقات بالکل غیر ضروری اور طلسمی معلوم ہوتی ہے تاہم واقعات میں اس کے بعد کچھ ہم آہنگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مشینی اور Press Button کیفیت نہیں رہ جاتی جو احمد بھائی کے بعد ضمیر پونا ہوٹل تک ملتی ہے۔ راجہ صاحب اپنے ٹھیکے کے ساتھ اور بہت سارے کاموں میں نیلو فر کو شریک رکھتے ہیں اور یہ شرکت راجہ صاحب کے نقطۂ نظر سے اپنے کاموں کے لیے رشوت ہے اور نیلو فر سمجھتی ہے کہ وہ اس طرح راجہ صاحب کی مدد حاصل کر کے زبیدہ کی زور دار شادی کر سکے گی جیسا کہ بعد میں ہوتا بھی ہے۔ راجہ صاحب کی ٹائپ بھی کچھ سیٹھ احمد بھائی سے ملتی ہے۔ احمد بھائی بے وقوف ہیں مگر راجہ صاحب اپنا کام نکالنا جانتے ہیں تاہم وہ سورج مل کی طرح نیلو فر کو دھوکا دینا نہیں چاہتے۔ راجہ صاحب کے ساتھ ناول بڑی تیزی کے ساتھ آخر تک چلتا رہتا ہے، اور اسپیڈ رائٹنگ (Speed writing) کی اچھی مثال بنتا ہے۔

پورے ناول میں مجموعی طور پر مصنف کا سطحی نظر سرمایہ دارانہ طبقہ اور جاگیرداروں کے اخلاق و عادات اور نفسیات کی عکاسی کرتا ہے یوں کوئی چاہے تو تنگ نظری اور تعصب کی عینک لگا کر اسے آزادیٔ ہندوستان کے بعد مسلمانوں کی کس مپرسی کا بھی عکاس بنا سکتا ہے۔ مگر پنجاب سے آئی ہوئی دھاردار لڑکی، مس ریٹا، مس پکل کے ساتھ اسی طرح کے اور اشارے و تذکرے، آنکھ کھول کر پڑھنے والوں کو گمراہ نہیں ہونے دیتے اور آخر میں موٹریں، فلیٹ، دولت کی فراوانی کا اظہار بڑے خوبصورت طریقے سے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نفسیات کے ساتھ مل کر اس ٹوٹے ہوئے دل کی خاموش مگر دھیمی آنچ رکھنے والی آواز کے اثر کو ہمارے احساسات پر محیط کر دیتا ہے، جس نے خود خراب ہونے کے بعد زبیدہ کو اس پیشے سے بچا کر اس کی شادی کرائی، سلیم کو موٹر سائیکل دلا کر اس کے دل سے اپنے گھناونے پیشے کی تلخی کم کی اور جس نے بیگم کی عیش پسند زندگی کی خواہش اور تمنا کا اظہار کر کے اصلی بیسوا کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیا اور جو خود پڑھنے والوں کی نظر میں وہی معصومہ بن گئی جس نے پہلی اخلاقی شکست کے خلاف مورچہ بنا کر سیٹھ احمد بھائی کا بھرتہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

مجموعی طور پر "معصومہ" ایک کامیاب ناول نہیں ہے صرف ایک اچھی کوشش ضرور ہے۔

پبلشر و پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا